ہیگل مارکس اور اسلامی نظام

(بقیہ باب ششم)

سود کی ممانعت سود کو ممنوع قرار دے کر اسلام نے معاشی زندگی کے ایک بڑے مفسدہ کو جڑ سے مٹا دیا۔ سود کی وجہ سے زر پرست ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ غریبوں کا خون چوسیں اور اُن کی گاڑھی کمائی سے اپنی دولت میں مزید اضافہ کریں۔ سود کا عام رواج دولت کی نامساوی تقسیم کا بھی سبب ہے۔ جس سوسائٹی میں یہ رواج عام ہو گا اُس پر ہمیشہ طبقہ داری کشمکش اور غربت وفلاکت کی لعنت مسلط رہے گی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نے ہر طرح کے سود کو ممنوع قرار دیا ہے خواہ وہ تجارتی اور کاروباری سود ہو یا اس کی نوعیت کچھ اور ہو۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے جیسا کہ آج کل بہت سے تجدد پسند کہا کرتے ہیں کہ تجارتی اور معاشی کاروبار کے سلسلہ میں جو سود دیا جاتا ہے اس کی نوعیت اس سود سے مختلف ہے جس کی ممانعت اسلام نے کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی احکام کی رو سے ہر قسم کا سود قطعاً ناجائز ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ معاشی کاروباری سود چیز ہی دوسری ہے وہ شاید اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ موجودہ ظالمانہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی سود ہے۔ اگر آج حکومتیں سود کو ممنوع قرار دیدیں تو یہ نظام اپنی موجودہ شکل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ سود میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ کاروبار میں لگاتا ہے اُسے کاروبار کے نفع و نقصان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ وہ سود کی معینہ رقم حاصل کرنے پر قانع ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ کاروبار سے منفعت تو حاصل کر لیتا ہے لیکن نقصان کی صورت میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا کہ سود کے بغیر سرمایہ کی فراہمی محال ہو گی اور بغیر سرمایہ کے بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو چلانا محال ہو گا حقیقتاً اس کے بالکل خلاف ہے۔ اگر سود کو مٹا کر اس کی جگہ منافع (Profits) کی بنیاد پر معاشی تنظیم استوار کی جائے تو اس کی وجہ سے موجودہ زمانہ کی بے شمار معاشی خرابیاں اصلاح پذیر ہو سکتی ہیں۔ سود اور منافع میں بڑا فرق یہ ہے کہ سود ایک معینہ رقم ہے لیکن منافع میں رقم کا تعین نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی جمع کی ہوئی رقم پر پانچ فی صدی سود حاصل کر سکتا ہے تو اسے بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ سال کے ختم پر اتنی رقم ملے گی۔ لیکن اگر کاروبار اصولِ منفعت پر چل رہا ہو اور اسے بتا دیا جائے کہ منافع کا اتنا فی صدی حصہ تمہیں ملے گا تب بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے ختم سال پر کیا ملے گا۔ کیونکہ پہلے تو وہ یہی نہیں جانتا ہے کہ تجارت کو نفع ہو گا یا نقصان۔ اور اگر نفع کا یقین بھی ہے تو بھی وہ اپنے حصہ کا تعین نہیں کر سکتا۔

سود کی وجہ سے روپیہ لگانے والوں (Investors) کو معاشی اور تجارتی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ہے۔ انھیں تو سال کے ختم پر سود کی وصولی سے مطلب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنکھ بند کر کے وہ اپنا روپیہ بنکوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن بنکوں کی پالیسی پر انھیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ نہ تو بنک کی کارروائیوں پر انھیں تنقید یا نکتہ چینی کا کوئی حق ہوتا ہے اور نہ اُن کا کوئی نمائندہ بینک کے معاملات میں اپنی کوئی آواز رکھتا ہے کم از کم ان لاتعداد روپیہ لگانے والوں کی حد تک یہ بالکل صحیح ہے جن کا تعلق سرمایہ داروں کے گروہ سے نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بینک کا پورا کاروبار بڑے سرمایہ داروں کے مفاد و اغراض کا تابع رہتا ہے۔ کیونکہ چھوٹے چھوٹے روپیہ لگانے والوں کی آواز وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ بینک جس طرح چاہتے ہیں ان کا روپیہ صرف کرتے ہیں۔ اس طرح بینکروں کے ہاتھ میں ایک ایسی قوت آجاتی ہے جسے وہ اپنے ہم طبقہ سرمایہ داروں کے مفاد و اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پھر چونکہ بینکنگ کا پورا نظام ایک محدود جماعت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے بطور لازمی نتیجہ کے ساری تجارت و صنعت اور سارے مالی ذرائع (Financial resources) پر بھی یہی محدود جماعت قابض ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بینکنگ کا نظام تجارت و صنعت کی بنیاد ہے۔ کوئی تجارت

اور صنعت بینکوں کے تعاون یا ان کی امداد کے بغیر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مالی نظام جس طبقہ کے ہاتھ میں ہوگا تجارت وصنعت پر بھی اسی کا قبضہ ہوگا۔ اسی صورت حال سے متاثر ہوکر ایک انگریز مصنف نے بطور طنز لکھا ہے کہ بینک آف انگلینڈ کا صدر زار روس سے کئی گنا زیادہ اقتدار و اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔ یہ استعارہ نہیں ہے حقیقت ہے۔

اگر سود کی جگہ معاشی کاروبار کی بنیاد منافع پر رکھی جائے تو ہر شخص اپنا روپیہ لگانے میں بڑی احتیاط اور دیکھ بھال سے کام لے گا کیونکہ اس صورت میں وہ صرف نفع کا شریک نہ ہوگا بلکہ نقصان میں بھی اُسے شرکت کرنا پڑے گی۔ مجبور ہوکر روپیہ لگانے والے بینک کے انتظام میں مؤثر نمائندگی کا مطالبہ کریں گے اور بینک کے کاروبار اور اس کی پالیسی پر ہر وقت نظر رکھیں گے۔ ساہوکاروں کی طاقت اس طرح بہت کم ہو جائے گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روپیہ لگانے والے صرف ایسے ہی کاروبار و صنعتوں میں اپنا روپیہ لگائیں گے جن کی ملک کو واقعی ضرورت ہو اور جن کی پیداوار کے لیے پہلے ہی سے بازار میں مانگ موجود ہو۔ ایسا نہ کرنے سے انھیں نقصان کا اندیشہ ہوگا۔ یہ نہ ہوگا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ سرمایہ ایسی پیداوار پر صرف کیا جائے جس کی مانگ بازار میں نہیں، پھر اس پیداوار کی نکاسی کے لیے مصنوعی طلب پیدا کی جائے (To create demand)۔ اب ہوتا یہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اپنے فاضل سرمایہ سے مزید منافع حاصل کرنے کے لیے ایسے نئی نئی اشیا بنانے میں صرف کرتا ہے جن کی مانگ نہیں ہوتی ہے۔ پھر اس خوف سے کہ مبادا اس پیداوار کی کھپت نہ ہو اشتہار بازی اور دیگر جائز و ناجائز طریقوں سے لوگوں میں نئی نئی خواہشات پیدا کی جاتی ہیں اور مصنوعی طور پر اُن کی ضروریات کو بڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ اِن اشیار کی خریداری پر مائل ہوں حالانکہ دراصل انھیں ان اشیار کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اسی وجہ سے ان چیزوں کی مانگ بھی پہلے سے نہیں ہوتی۔ یہ چیز بھی براہ راست موجودہ بینک کاری (Banking) کے نظام کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اہل صنعت (Industrialists) کو بینکوں کی وجہ سے بآسانی سرمایہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بینکوں پر بھی سرمایہ داروں کا قبضہ ہے اور صنعت پر بھی۔ اس لیے معاشی زندگی کے ان دونوں ستونوں کی

ہی لٹکی رہتی ہے۔

لیکن اگر سود کے بجائے منافع پر صنعتی اور مالی نظام چلایا جائے تو یہ صورت حال باقی نہیں رہے گی۔ منافع پر کاروبار کی صورت میں روپیہ لگانے والے مجبور ہوں گے کہ وہ یا تو خود کسی طریقہ سے بینکوں کے حساب وکتاب پر نگرانی رکھیں یا حکومت سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ وہ بینکوں کے حسابات کی جانچ پڑتال اور تنقیح کے لیے عمال مقرر کرے۔ دوسری صورت زیادہ قرین قیاس ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ بینک کاری افراد کے ہاتھ سے نکل کر حکومت کے ہاتھ میں آجائے گی یا کم از کم بینکوں پر اس کی موثر نگرانی قائم ہو جائے گی۔ اس طرح بے قید سرمایہ داری کا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اگر بینک کاری کا نظام اس طرح سے بالکلیہ حکومت کے ہاتھ میں آجائے تو حکومت پوری صنعتی اور معاشی زندگی کو اپنی موثر نگرانی میں لے سکے گی۔ کیونکہ بینک کاری معاشی نظام کی شہ رگ ہے۔ لیکن یہ اُسی صورت میں مفید ہو گا جب خود حکومت پر عوام الناس کے حقیقی نمائندوں کا قبضہ ہو یعنی ان لوگوں کا جو دل وجان سے عوام کی فلاح وبہبود کے خواہاں ہوں۔ ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بینک کاری نظام تو حکومت کے ہاتھ میں ہو لیکن روپیہ لگانے والے بھی نگرانی اور مشاورت کی غرض سے مجالس انتظامی میں اپنے منتخب نمائندے بھیجیں تاکہ یہ نظام، حکومت اور افراد کے باہمی تعاون پر مبنی ہو۔

اکتناز مال کی ممانعت غیر متوازن اور بے قید سرمایہ داری کو مٹانے کی غرض سے اسلام نے اکتناز مال Accumulation of wealth کو قطعاً ممنوع قرار دیا چنانچہ کلام مجید نے صریح الفاظ میں اعلان کیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ	ان لوگوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو جو
وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ	سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس میں کا کوئی حصہ خدا
اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى	کی راہ میں صرف نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا جب ان کے
بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ	چہرے اور پیشانیاں اسی سونے چاندی سے داغی

چیز اشتراکی نظام اور اسلام کے مابین وجہ امتیاز ہے۔

اشتراکیت نے معاشی زندگی کو سُدھارنے کے لیے صرف خارج میں ضابطہ بندیاں کرنے پر انحصار کر لیا اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ ضابطہ محض جبر اور مادّی طاقت کے بل پر قائم ہوتا ہے اور جو نظام محض زور وطاقت اور جبر پر قائم ہو اس کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ تمدن کے کسی ضابطہ کو بقا و دوام نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ جمہور کے اپنے دلوں میں بھی اُس مقصد کے حصول کی لگن نہ ہو جسے قانون وضابطہ بزور وجبر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اشتراکی نظام انسان کی پوری معاشی زندگی کو ضابطہ وقانون کی بندش میں جکڑ کر رکھ دیتا ہے اور اس زندگی کے کسی گوشے میں بھی انسان کے ارادے اور مرضی کو آزاد نہیں چھوڑتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام کے تحت انسان کے اخلاقی احساسات حالتِ تعطل میں رہیں گے اور قدرت کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ کسی قوت کا جمود وتعطل اس کی موت ہے۔ جس دنیا میں ہمدردی، صلہ رحمی، عزیز واقربا کی امداد، غربا کی دستگیری کے مواقع ناپید ہوں، جہاں کسی شخص کو انفرادی طور سے اور اپنی آزاد مرضی سے کسی پر رحم کھانے، کسی کے کام آنے، کسی کو اپنی کمائی میں شریک کرنے کا موقعہ نہ ہو جس جماعت کے افراد باہمی معاملت اور آپس کے تعلقات میں ایثار وقربانی کی روح سے خالی ہوں، اس میں اخلاقی احساسات کا نشوونما غیر ممکن ہے۔ چونکہ اشتراکی نظام کا مقصد ایک ایسی سوسائٹی کی تعمیر ہے جس میں کوئی فرد دوسرے کی معاشی امداد کا محتاج نہ ہوگا اور نہ کوئی شخص دوسرں کی امداد کو اپنا اخلاقی فرض خیال کرے گا اس لیے اس نظام میں انسان کی بعض اعلیٰ خصوصیات اور شریف جذبات مثلاً غرباء کی اعانت، حاجتمندوں کی حاجت روائی، اور بیماروں کی عیادت وخبر گیری، اور اسی نوع کے دیگر انسانی خصائل یکسر ناپید ہو جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظام میں اجتماعی ادارے اِن فرائض کو سرانجام دیں گے۔ لیکن اول تو اجتماعی امداد شخصی اعانت کا بدل نہیں ہو سکتی، دوسرے جب افراد میں انفرادی طور پر اس صنفِ اخلاق کا نشوونما بند ہو جائے گا تو اجتماعی اداروں کو وہ آدمی مل کہاں سکیں گے جن کے دل دوسروں

کے لیے رحم و شفقت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات سے لبریز ہوں ؛ شخصی اعانت اخلاقی احساس کی بیداری اور حرکت کا پیمانہ ہے۔ اجتماعی امداد اور اخلاقی احساس کے مابین کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ قائم شدہ روایات، عام رائے کا دباؤ یا محض جذبۂ تقلید اس نوع کی امداد کا محرک ہو سکتا ہے۔ بخلاف اس کے شخصی اعانت کا جذبہ صرف اخلاقی احساس سے تحریک پاتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام معاشی زندگی کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ و قانون کی طاقت کے حوالے کر کے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے، اور اس کے تصورات کی اصلاح، اس کی سیرت و ذہنیت کی تشکیل، اور ایک مناسب اجتماعی ماحول کی تخلیق کے ذریعہ سے بالواسطہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی احساسات کا یہ آزاد عمل غلط سمت میں نہ جائے۔ اس طرح اسلام نے دیگر تمام امور کی طرح معاشی امور میں بھی انسان کے آزاد اور با اختیار ارادہ کے لیے ایک ایسا میدان چھوڑ دیا ہے جہاں اس پر اخلاقی احساسات کے سوا قانون یا حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے تاکہ اس میدان میں اس کی اخلاقی آزمائش ہو سکے۔ اگر اشتراکیت کی طرح اسلام نے بھی جملہ معاشی امور کو قانون اور حکومت کے قبضہ میں دیدیا ہوتا تو پھر اس اخلاقی آزمائش کا کوئی موقع باقی نہ رہتا۔ جو شخص قانون کی رو سے اس بات پر مجبور ہو کہ اپنی کمائی ایک لاشخصی (Impersonal) ادارہ کے حوالہ کر دے اور پھر اس میں سے صرف اتنا ہی حصہ واپس لے جتنا اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو اُس پر اخلاقی اچھائی یا بُرائی کا حکم کس طرح لگایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس عمل میں اس کا آزاد ارادہ نہیں بلکہ قانون کا خوف کام کر رہا ہے۔ البتہ اگر حکومت اور قانون کے خوف سے بے پروا ہو کر اُس سے یہ عمل سرزد ہوتا تب اس کے اخلاقی نشو ونما کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا۔

اسی لیے اسلام نے انفاق فی سبیل اللہ کی پُرزور تلقین کی اور بتایا کہ نیکی حاصل نہیں ہو سکتی اگر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت انسان میں راسخ نہ ہو جائے۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔

گویا حکومت اور قانون کو درمیان میں لائے بغیر اسلام انسان کے اخلاقی احساس کو اتنا مضبوط دیکھنا چاہتا ہے کہ جہاں خارج سے اس پر کوئی دباؤ یا دنیا کی ملامت وسرزنش کا کوئی موقع نہ ہو وہاں بھی ایک انسان دوسرے کی اعانت ودستگیری کو اپنا فرض منصبی خیال کرے۔ مسلمانوں کی شناخت بتلاتے ہوئے قرآن حکیم فرماتا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اُس میں سے راہ خدا میں صرف کرتے ہیں)، وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (وہ لوگ جو اپنے مال کو ظاہر اور پوشیدہ طور سے خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں)۔ پورا قرآن دیکھ جائیے تو معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ اور نماز کے بعد اگر کسی عمل کی بہ تکرار تلقین کی گئی ہے تو وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ لیکن انفاق فی سبیل اللہ اخلاقی فضیلت رکھنے کے علاوہ معاشی اہمیت کا بھی سرمایہ دار ہے۔ جس جماعت میں انفاق کی روح کام کر رہی ہوگی اس میں غربت وافلاس اور درد ومصیبت کی صدائیں مشکل سے سنی جا سکیں گی۔ جس سوسائٹی میں غریبوں کی دستگیری، محتاجوں کی اعانت، یتیموں کی خبرگیری اور اقربا کی ہمدردی کا جذبہ برسرکار ہوگا وہاں معاشی تنگدستی کی شکایت پیدا ہی نہ ہوگی، جہاں انفاق کی سرگرمیاں ہوں گی وہاں گردش زر Circulation of money میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں اس میں رکاوٹ نہ ہوگی وہاں معاشی خرابیوں کا ایک بڑا دروازہ آپ سے آپ بند رہے گا۔ کیونکہ دنیا کے اکثر وبیشتر معاشی مفسدات اسی راہ سے آتے ہیں۔ گردش زر جتنی مکمل ہوگی معاشی زندگی اتنی ہی پرسکون ہوگی۔

اس طرح معاشی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو اس کے لیے ممکن ہو سکتی تھیں اور اس میدان میں وہ اشتراکیت سے اس کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام معاشی مساوات (Economic equality) سے زیادہ معاشرتی مساوات (Social equality) کا حامی اور موید ہے۔ معاشی مساوات اسے صرف اس حد تک مطلوب ہے کہ اجتماعی دولت کسی خاص طبقہ میں محدود نہ ہونے پائے۔ بلکہ جماعت کے زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم ہو اور ہر شخص کو اتنی روزی ضرور میسر آ جائے کہ وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ابتدائی ضروریات پوری کر سکے۔ اشتراکیت

کی طرح اسلام یہ نہیں چاہتا ہے کہ جملہ افراد معاشی حیثیت سے یکساں حالت میں ہوں یا معاشی زندگی کی اونچ نیچ بالکل ہموار اور ہم سطح ہو جائے۔ وہ ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے اور معاشی نامساوات کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا ہے بشرطیکہ یہ نامساوات ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ البتہ جس چیز کو وہ یکسر مٹا دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ دولت یا تموّل کی بنا پر افراد کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق و امتیاز پیدا ہو یا دولت ہی عزت کا واحد معیار ہو جائے۔ اس معاملہ میں اس کی راہ بالکل الگ ہے چنانچہ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت دار وہی ہے جس کے دل میں سب سے زیادہ اس کا خوف ہو وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنے آیا ہے جس میں دولت، علم، ہنر، عہدہ، نسل یا خاندان کوئی بھی عزت کا معیار نہ ہو اور جہاں فرق و امتیاز کی صرف ایک وجہ تسلیم کی جائے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو خدا ترسی اور خدا پرستی میں کیا درجہ حاصل ہے۔

معاشرتی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے نماز باجماعت کو ہر مسلمان پر لازم قرار دیا ہے یہ ایک بڑا نفسیاتی حربہ ہے جس سے وہ اپنے پیروؤں میں معاشرتی مساوات اور اخوت کی رُوح پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز باجماعت کے التزام سے معاشرتی امتیازات پر ایک کاری ضرب پڑتی ہے۔ مندروں میں یکے بعد دیگرے پوجا پاٹ کرنے یا کلیساؤں میں ہفتہ میں ایک روز کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھ کر عبادت کرنے سے اخوت و مساوات کا وہ احساس پیدا نہیں ہوتا جو مسجدوں میں روزانہ پانچ وقت ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر عبادت کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ کسی مقام کے تمام مسلمان بلا فرق و امتیاز روزانہ پانچوں وقت مسجد میں اس طرح جمع ہوں اور پھر بھی ان میں باہم وہ بُعد و فصل باقی رہے جو معاشی درجہ بندیوں کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے جو آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اہلِ ثروت اور اونچے طبقے کے لوگ اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو مساجد میں جماعت کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا اپنے مکان کے کسی گوشہ میں۔ عیدین اور جمعہ کے موقع پر تو وہ البتہ مسجد میں نظر آتے ہیں مگر روزانہ پانچ وقتوں میں سے ایک وقت بھی ان کی صورت مسجد میں نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ

یہی ہے کہ اگر وہ مسجد میں پانچوں وقت کی نماز ادا کرنا شروع کریں تو پھر وہ اپنے امتیازات اور معاشرتی مرتبہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معاشرتی مساوات کا قیام معاشی مساوات کے حصول سے کہیں زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ کیونکہ معاشی مساوات کے حصول کے بعد بھی طبقہ واریت Class-stratification پیدا ہو سکتی ہے۔ اشتراکیت نے انسانی زندگی کے اس نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر دیا کہ طبقاتی امتیازات مختلف شکلوں میں ظہور کر سکتے ہیں۔ طبقہ واریت تنہا دولت اور معاش کی راہوں سے نہیں آتی ہے۔ دوسری راہوں سے بھی اس مہلک مرض کا پھیلنا ممکن ہے۔ اس کا قوی احتمال ہے کہ انسان معاشی حیثیت سے تو ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوں لیکن نسل، خاندان، عہدے یا اور کسی اعزاز کی بنا پر ان میں امتیازات پیدا ہو جائیں۔ اس صورتِ حال کی مثالیں ہمیں ہندوؤں کی معاشرت میں بکثرت ملتی ہیں جہاں برہمنیت کسی معاشی مفاد پر نہیں بلکہ مذہبی اقتدار پر مبنی ہے۔ اسی طرح چھتریوں نے اپنی ایک علیحدہ معاشرت بنالی ہے۔ ساہوکار اور تجار مالدار ہونے کے باوجود برہمنوں اور چھتریوں سے کمتر درجہ رکھتے ہیں۔ اشتراکیت کے قیام کے بعد بھی ممکن ہے کہ طبقہ واریت کسی اور شکل میں نمودار ہو جائے۔ کسان اور مزدور، عالم اور عامی، پرولتاریہ اور اشتراکی حکمرانوں کے مابین طبقاتی امتیازات اور معاشرتی درجہ بندیوں کے حدود فاصل قائم ہو جائیں۔ اور معاشی حیثیت سے یکساں ہونے کے باوجود ان کے آدابِ معاشرت میں نمایاں فرق پیدا ہو جائے۔ اسی صورتِ حال کو دفع کرنے کی غرض سے اسلام نے اجتماعی عبادات کا نظام تیار کیا ہے تاکہ مسلمانوں میں باہم کوئی ایسا فرق و امتیاز نہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اپنے مشترک نصب العین کے مطابق زندگی نہ بسر کر سکیں یا ان کے معاشرتی اختلافات سیاسی اور مذہبی اختلافات کے سانچے میں ڈھل جائیں۔